باسمہٖ تعالیٰ

لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ ..... (۲۰/۶۸)

خوف

(قاطعِ شرفِ انسانیت)

پرویزؔ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خوف و حزن

(قاطعِ رگِ حیات)

علامہ اقبالؒ نے خوف و حزن کو "اُمّ الخبائث اور قاطعِ حیات و توحید" قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ ؎

ہر شر پنہاں کہ اندر قلبِ تست — اصلِ او بیم است اگر بینی درست

لابہ و مکاری و کین و دروغ — این ہمہ از خوف می گیرد فروغ

پردۂ زور و ریا، پیراہنش!

فتنہ را آغوشِ مادر دامنش (رموزِ بیخودی ص۱۱)

تمہارے قلب میں جو شر بھی پوشیدہ ہے، اگر غور سے دیکھو تو صاف نظر آ جائے گا کہ اس کی اصل، خوف ہے۔ چاپلوسی، مکاری، کینہ، جھوٹ۔ یہ تمام خباثتیں خوف سے پرورش پاتی ہیں۔ منافقت اور فریب اس کے پردہ پوش ہوتے ہیں، اور ہر قسم کا فتنہ اس کے دامن میں یوں پرورش پاتا ہے جس طرح طفلِ نوزائیدہ آغوشِ مادر میں۔

اسی حقیقت کو وہ (نثر میں) ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

اسلام، نظامِ فطرت میں کرب و اذیّت، گناہ اور کشمکش کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی ارتقاء کے راستے میں یہ موانعات حائل نہیں۔ یہ درحقیقت خوف ہے جس کا یہ شکار ہوتا ہے۔ انسان اپنے سلسلۂ ارتقاء کی بلند ترین سطح پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ خوف اور حزن سے یکسر آزاد ہو جائے...... اسلام کا اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے آزاد کر کے اسے اس کی ذات کی ممکنات اور مضمر قوتوں کا احساس دلا دے اور اس کے شعور میں اس حقیقت کو بیدار کر دے کہ اس کی ذات لامنتہی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ (آگے چل کر اقبالؒ کہتا ہے) اسے پھر سمجھ لیجئے کہ دنیا میں ہر برائی (VICE) کی جڑ خوف ہے۔

(THOUGHTS AND REFLECTIONS OF IQBAL PP. 34-37)

وہ کہتے ہیں کہ آپ تاریخِ انسانیت پر غور کیجئے۔ آپ کو نظر آجائے گا کہ ہر دور میں، مستبد اور جابر قوتوں نے زیر دستوں پر اس قدر خوف مسلط کر رکھا تھا کہ ان میں جوہرِ انسانیت کی رمق تک باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ ظہورِ اسلام کے وقت حالت یہ ہو چکی تھی کہ ؎

بود انسان در جہاں انسان پرست ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندھا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت باجے بر کشتِ خرابِ او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش بہرِ ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ (ایضاً ص ۱۱۹)

انسانوں کا ایک گروہ دوسرے انسانوں کی پرستش کرتے کرتے، اس درجہ پامال اور خستہ حال ہو چکا تھا کہ اس کی اپنی ہستی ہی باقی نہیں رہی تھی۔ ایک طرف ملوکیت کے استبداد نے اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑ رکھے تھے۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے ملّا اور نظامِ سرمایہ داری کے قارون، گِدھوں کی طرح اس کے جسدِ بے جان کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے —— ایک شکار اور سینکڑوں شکاری —— صاحبِ تاج و تخت (بادشاہ) اور مذہبی پیشوائیت کے استحصال کا یہ عالم تھا کہ اس کی کھیتی، خواہ وہ برباد اور ویران ہو کیوں نہ چکی ہو، وہ اپنا ٹیکس وصول کر کے رہیں گے۔ پادری اس کی محنت کے پسینے کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر، جنت کا پروانہ اس کے ہاتھ میں تھما دیتا تھا۔ برہمن اس کی پھلواری کا آخری پھول تک نوچ کر لے جاتا تھا۔ اور آتش کدوں کے مغ اس کے کھلیان کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتے تھے۔

غرضیکہ صدیوں کی غلامی اور محکومی سے اس کی فطرت پست ترین درجہ پر پہنچ چکی تھی، اور اس خوف و ہراس سے نغمۂ حیات اس کی رگوں میں خون بن کر جم چکا تھا۔

صدیوں کے خوف و ہراس نے اس کی یہ حالت کر رکھی تھی۔

قرآنِ کریم نے تاریخِ انسانیت کے جن گوشوں کو اپنے دامن میں لپیٹ رکھا ہے اس سے بھی اس حقیقت کی پردہ کشائی مقصود ہے کہ جابر و قاہر، مستبد اور ظالم اربابِ قوت و اقتدار، جب زیر دست، محکوم و مقہور انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے تو نوعِ انسان کا غمخوار، ضعیفوں اور ناداروں کا بہی خواہ،

پیغام بردارانِ خداوندی

مظلوموں اور محکوموں کا یاور، ایک انسان، خدا کا یہ پیغام ان مستبد اربابِ اقتدار تک پہنچاتا کہ تمہیں اپنے ہی جیسے انسانوں پر حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ تم ان کی محنت کی کمائی کے مالک نہیں بن سکتے۔ تم ان پر خوف و ہراس طاری کر کے، ان کی جرأتوں کو پامال، ان کے حوصلوں کو پست اور ان کی عزتِ نفس کو ضعف کا سد

کی طرح اپنی حرص و آز کی منڈیوں میں فروخت کر دیتے ہو۔ تمہیں اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ آزادی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ تم انہیں اس سے محروم نہیں کر سکتے۔ حریت، جوہرِ انسانیت ہے۔ تم اسے سلب نہیں کر سکتے۔

وہ (خدا کے رسولؑ) خدا کا یہ پیغام ان اربابِ جبر و استبداد تک، دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتے، لیکن یہ اس کا جواب اینٹ اور پتھر سے دیتے اور ہر وہ حربہ استعمال کرتے جس سے یہ پیغامبر خائف ہو جائیں اور عوام ڈر کے مارے، ان کا ساتھ نہ دیں۔ تمام انبیاءؑ سابقہ اور اقوامِ گذشتہ کی داستانوں کا یہی ملخص اور یہی ماحصل ہے۔ قرآنِ کریم اس سلسلۂ دعوت کا آغاز حضرت نوحؑ سے کرتا ہے۔ وہ ان اکابرین تک خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ: لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (۲۶/۱۱۶) "اے نوحؑ! اسے اچھی طرح سن رکھو۔ تمہاری اس قسم کی باتوں سے معاشرہ میں فساد برپا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اگر تم اپنی دعوت سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے" ــــــ وہی، ان پر خوف طاری کرنے اور عوام کو ہراساں کرنے کا حربہ!

قومِ نوحؑ کے بعد ہمارے سامنے قومِ عادؔ آتی ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی وہی پیغامِ خداوندی ان تک پہنچایا، اور (اسی طرح) علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رُو سے پہنچایا۔ انہوں نے اس کے جواب میں کس کس قسم کی سازشیں کیں، انہیں قرآن نے دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے۔ حضرت ہودؑ نے ان اکابرین سے کہا کہ: فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (۱۱/۵۵) تم میرے خلاف جس قدر سکیمیں (خفیہ سازشیں) تیار کرتے رہتے ہو، ان کے مطابق تم نے جو کچھ کرنا ہے، کر گزرو، اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ خفیہ سازشوں کا اوّلیں مقصد فریقِ مقابل کے دل میں خوف و ہراس پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ ڈر کر اپنی دعوت کو ترک کر دے، تو فبہا ورنہ اگلا قدم اٹھایا جاتا ہے۔

قومِ عادؔ کے بعد ہمارے سامنے قومِ ثمودؔ آتی ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ تشریف فرما ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی ان سے کہا کہ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۷/۷۴) "ملک میں فساد برپا نہ کرتے پھرو" ــــــ اور اس کے بعد نہایت نرمی اور شفقت سے انہیں، بدلائل و براہین سمجھاتے رہے کہ ان کے ظلم و استبداد کا نتیجہ خود ان کی تباہی ہوگا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ان مفسدین کے نو سرغنے تھے جو ملک میں تباہی مچاتے رہتے تھے[۱]۔ انہوں نے حضرت صالحؑ کی دعوت کا جو جواب دیا اسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا

---

[۱] ملک کے اربابِ اقتدار کی تعداد تھوڑی سی ہوتی ہے لیکن وہی تمام فسادات کی جڑ ہوتے ہیں۔

مَهْلِكَ أَهْلِهٖ وَإِنَّا لَصٰدِقُوْنَ o (۲۷/۴۹)

انہوں نے باہمی مشورہ کیا اور ایک دوسرے سے کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر صالحؑ اور اس کے ساتھیوں پر رات کو حملہ کریں گے اور پھر مقتولین کے ورثاء کے سامنے صاف مکر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے انہیں ہلاک ہوتے دیکھا تک نہیں۔ ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔

اس سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ انہوں نے تخویف و ترہیب کی کس قدر دہشت انگیز فضا پیدا کر رکھی تھی اور ان کے عزائم کیا تھے؛ یہ تھا حضرت صالحؑ کی تذکیر و تلقین کا ردِّ عمل!

اس کے بعد ہمارے سامنے حضرت ابراہیمؑ آتے ہیں۔ ان کی تو ساری زندگی اسی کشمکش کی لرزہ انگیز داستان ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! ذرا سوچئے تو سہی آپ کا مسلک کیا ہے؟ آپ اپنے ہاتھ سے ایک بت تراشتے ہیں اور پھر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ عقل و شعور کی دنیا میں کیا اس مسلک کو معقول کہا جا سکتا ہے؟ باپ کی طرف سے اس کا جواب کیا ملا؟ یہ کہ، لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا..... (۱۹/۴۶) اسے کان کھول کر سن لو۔ اگر تم ان باتوں سے باز نہ آئے تو میں تمہیں دھتکار دوں گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ان تمام مناصب و املاک سے، جو تمہیں ورثہ میں ملنے والی ہیں، محروم ہو جاؤ گے۔ اگر تم اپنی خیر چاہتے ہو تو میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔

آپ کو معلوم ہے حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے اس دھمکی کا جواب کیا ملا تھا؟ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ..... (۱۹/۴۷) میری آرزو یہ ہے کہ آپ صحیح راستہ اختیار کر کے امن و سلامتی سے رہیں۔ میں خدا سے دعا کرتا رہوں گا کہ آپ کو ایمان عطا ہو اور اس طرح آپ کفر و شرک کی وجہ سے آنے والی تباہیوں سے محفوظ رہیں۔

اس کے بعد جب آپ نے یہی تلقین اپنی قوم سے کی تو ان کی آتشِ انتقام کے شعلے آسمان گیر ہو گئے۔ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ..... (۲۱/۶۸)۔ "انہوں نے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور ان سے کہا کہ اگر تم میں غیرت و حمیت کی کوئی رمق بھی باقی ہے تو اٹھو اور اس شخص کو زندہ جلا دو۔"

قومِ لوط جس فعلِ شنیع کو اپنی روش بنائے ہوئے تھی، اس کے تصور تک سے گھن آتی ہے۔ حضرت لوطؑ نے ...... نہایت شفقت اور نرمی سے اس روش کی تباہ کاریوں کے متعلق انہیں سمجھایا اور اس سے باز رہنے کی تلقین کی۔ ان کی اس تلقین و تذکیر کا جواب یہ تھا کہ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ o (۷/۸۲) "انہوں نے کہا کہ یہ لوگ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں۔ انہیں اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔"

حضرت شعیبؑ قومِ مدین کی طرف مبعوث ہوئے جنہوں نے اپنے ہاں کے اقتصادی نظام کو بُری طرح بگاڑ رکھا تھا۔ انہوں نے اس کی اصلاح کی کوشش کی اور سمجھایا کہ اس کا نتیجہ کس قدر

ہلاکت آفرین ہوگا۔ اس کے جواب میں مستکبرین قوم نے کہا کہ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ...... (۷/۸۸) "اے شعیبؑ! ہم لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا چاہتے۔ تم اور تمہاری جماعت کے افراد، یا تو ہمارا مسلک اختیار کرلیں، ورنہ ہم تم سب کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ اس کے بعد تم خود فیصلہ کرلو کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش تو دنیا کی تاریخ کا اہم حصہ بن چکی ہے۔ انہوں نے بڑی نرمی سے فرعون سے کہا کہ بنی اسرائیل کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا خلافِ انسانیت ہے اور دلائلِ مقاطع سے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کے عواقب خود اس کے حق میں اچھے نہیں ہوں گے۔ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ: لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰـهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝ (۲۶/۲۹) "اگر تم نے یہ دعویٰ کیا کہ یہاں کا حاکم میں نہیں، کوئی اور ہے، تو سمجھ رکھو کہ تمہارا ٹھکانہ جیل خانہ ہوگا! قوم حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر لبیک کہنے کے لئے تیار تھی لیکن فرعون نے ان پر اس قدر خوف طاری کر رکھا تھا کہ وہ اس کی جرأت نہیں کر سکتے تھے (عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ ...... ۱۰/۸۳) جب دربارِ فرعون کے مذہبی پیشوا (پروہت) حضرت موسیٰؑ کی براہینِ نیرہ سے متاثر ہوکر ان کی دعوت کی صداقت کے قائل ہوگئے تو فرعون ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا اور کہا کہ: اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ...... (۷/۱۲۳)۔ ہیں: میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں!! تم نے میری اجازت کے بغیر ہی موسیٰؑ کی دعوت کی صداقت کو تسلیم کرلیا! تم دیکھو کہ میں تمہارا حشر کیا کرتا ہوں۔ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۷/۱۲۴) میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا تا ہوں اور پھر تم سب کو سولی پر چڑھاتا ہوں!

حضرت مریمؑ نے ہیکل کی عائد کردہ ناروا پابندیوں کو توڑا تو انہوں نے ان پر عرصۂ حیات اس قدر تنگ کردیا کہ انہیں اپنے بچے کو لے کر، اور دیس چلے جانا پڑا۔ اور پھر خود حضرت عیسیٰؑ کے خلاف جو کچھ کیا اس سے کون واقف نہیں۔ آپ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے وعظ دیکھئے۔ کس قدر دلائل و شواہد پر مبنی اور حسین و دلکش تشبیہات سے مزین ہیں۔ یہودیوں کی طرف سے اس قسم کے مواعظ کا جواب صلیب تھا!

(۰)

ظہورِ اسلام

انسان، تاریخ کی اس دہلیز پہ کھڑا تھا جب حضورؐ رحمۃ اللعالمین کی بعثت اور قرآن کا نزول ہوا خوف و ہراس کا مارا ہوا انسان۔ ڈرا اور سہما ہوا انسان! اس انسان سے قرآن نے کہا کہ اب خوف اور ہراس کا دور ختم ہوا۔ اب تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہے سیدھا راستہ۔ اس پر چلتے جاؤ تو تمہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۳۸)

جو ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلتا جائے گا۔ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

آپ قرآن کی دفتین کو کھول کر دیکھئے۔ قدم قدم پر آپ کو یہ بشارتِ عظمیٰ درخشندہ حروف میں لکھی ملے گی کہ ——— لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

قبل اس کے کہ ہم ان مقامات کو سامنے لائیں جہاں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ وہ کونسے اسباب ہیں جن سے خوف اور حزن لاحق ہوتا ہے، اور کونسے اقدامات جن سے ان سے تحفظ حاصل ہوتا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کا مفہوم واضح کر دیا جائے جنہیں قرآن نے ساتھ ساتھ استعمال کیا ہے۔

خوف اور حزن کا مفہوم

بدیہی طور پر ان الفاظ کو مرادف المعنیٰ سمجھا جاتا ہے اور ان کا مفہوم "ڈر" لیا جاتا ہے لیکن سطح سے ذرا نیچے جاکر دیکھیں تو ان دونوں میں بڑا لطیف فرق نظر آئے گا۔ عام فہم الفاظ میں، خوف کے متعلق یوں سمجھئے کہ یہ اس خطرہ کا پیدا کردہ احساس ہوتا ہے جو محسوس طور پر سامنے آجائے۔ جنگل میں سفر کرتے وقت اگر شیر کے دھاڑنے کی آواز کانوں میں آجائے' یا اژدہا پھنکار رہا ہو تو ہم ڈر جاتے ہیں۔ یہ محسوس خوف کی مثال ہے۔ یا ایسا خطرہ جس کی توجیہ سمجھ میں آجائے۔ گھر کی بوسیدہ چھت کے نیچے بیٹھے، یا سوتے وقت ہم ڈرتے ہیں کہ وہ کہیں گر نہ پڑے۔ یہ بھی خوف ہے۔ لیکن حُزن، دل کی اس دردانگیز افسردگی اور اندوہناک آزردگی کا نام ہے جسے ہم نہ کسی کو دکھا سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے۔ اور اکثر اوقات تو اس کا کوئی سبب خود ہماری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتا، چہ جائیکہ ہم اسے دوسروں کو سمجھا سکیں۔ اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: ؎

ہے کوئی بات آج ہونے کو!

جی بہت چاہتا ہے رونے کو

خوف کے اسباب محسوس ہوتے ہیں اس لئے اس کی مدافعت محسوس طور پر کی جا سکتی ہے، لیکن حُزن درحقیقت انسان کے لاشعور میں دبے ہوئے خطرات کے پیدا کردہ رنج و الم اور اندوہ و ملال کا نام ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کے انگریزی تراجم میں خوف کا ترجمہ (FEAR) اور حزن کا (GRIEF) کیا جاتا ہے۔ ذہنی طور پر تو ان الفاظ کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے مگر حُزن سے جو چوٹ دل پر پڑتی ہے، وہ اُبھر کر سامنے نہیں آتی لیکن اندر ہی اندر مغزِ استخواں تک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے مرزا مظہر جانِ جاناں کا ایک بڑا خوبصورت لیکن عمیق شعر ہے جس میں خوف اور حُزن کے اثرات کو بڑے لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ؎

صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است

خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است!

جب تیشہ پتھر پر پڑتا ہے، اس کی آواز میں، اور جب وہ جگر پر پڑتا ہے، اس کی صدا میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ صدا نہ کسی کو سنائی جا سکتی ہے، نہ اس کی چوٹ کسی کو دکھائی جا سکتی ہے۔ ریاض خیرآبادی نے اسے اپنے شوخ انداز میں یوں تعبیر کیا ہے کہ: ؎

کیسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے!
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ بو کیا ہے!

"مستبد حاکم قید نہ کر دے" ——— یہ خوف ہے ——— "وہ کہیں بے عزتی نہ کر دے" —— یہ حُزن ہے ——— دل کی اس کیفیت کو نہ سمجھ سکنے والے عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ تم اس قدر ملولِ خاطر کیوں ہو؟ اس نے تمہیں تھپڑ تو نہیں مار دیا۔ قید تو نہیں کر دیا۔ پھانسی کے تختہ پر تو نہیں لٹکا دیا۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ تذلیلِ انسانیت، تھپڑ، قید، حتیٰ کہ پھانسی سے بھی زیادہ اذیت رساں اور کرب انگیز ہوتی ہے۔ یہ خوف نہیں، حزن ہے۔

ایک اور مثال میں یوں سمجھئے کہ ایک شخص کسی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اُسے سزا کا ڈر ہوتا ہے۔ یہ خوف ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے فلاں درگاہ پر ایک منت مانی تھی جسے میں نے پورا نہیں کیا۔ اب مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدا معلوم مجھ پر کونسی آفت آ جائے ——— یہ حُزن ہے ——— اسے آپ نفسیاتی اضطراب کہہ سکتے ہیں۔

خوف اور حُزن کے فرق کی اور مثالیں بھی ہیں۔ انہیں ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ سرِدست اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ قرآنِ کریم اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ اگر تم اس کے متعین کردہ راستے پر چلو گے تو تمہیں کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حُزن ——— خوف سے محفوظیت کا نتیجہ امن ہوتا ہے، اور حُزن سے مامونیت سے اطمینان حاصل ہوتا ہے ——— اتباعِ قرآن کا لازمی نتیجہ امن اور اطمینان ہوتا ہے۔

——— (٥) ———

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، قرآنِ کریم نے پہلی ہی سورۃ (سورۃ البقرہ) میں، قصۂ آدم بیان کرتے ہوئے، نوعِ انسان (بنی آدم) سے کہا ہے کہ تم سے اگر کوئی لغزش ہو جائے تو اس سے مایوس ہو جانے کی کوئی بات نہیں۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۳۸) : (۲۵)

نہ خوف نہ حُزن | "ہماری طرف سے، تمہیں راہنمائی ملا کرے گی۔ جو بھی اس راہنمائی کا اتباع کرے گا، اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا' نہ حزن۔"

دیگر مقامات پر اسے مختلف انداز سے دہرایا گیا ہے، مثلاً

---

[1] میں نے اس موضوع پر اپنے ایک اور مقالہ میں بھی گفتگو کی ہے جس کا عنوان تھا۔ "کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔"

(۲) اسی سورۃ (بقرہ) میں کہا گیا ہے کہ دُنیا کی کوئی قوم ہو اور کسی مذہب کی پیرو، جو بھی قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ایمان لائے گا اور اس کے کام قرآنی معیار کے مطابق صالح ہوں گے تو

فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

(۲/۶۲) نیز (۵/۶۹)

اُن کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملے گا۔ اور وہ اجر یہ ہوگا کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔

(۳) ذرا آگے چل کر کہا کہ

مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ٥ (۲/۱۱۲)

جس نے بھی قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور پھر قرآنی معیار کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی، تو خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے اسے اس کا اجر مل جائے گا۔ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

(۴) سورۃ انعام میں، اسے اختصاراً بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ٥ (۶/۴۸)

جو قرآنی حقائق پر ایمان لے آیا اور اعمالِ صالح ہوئے، تو اسے نہ خوف ہوگا نہ حزن۔

(۵) سورۃ بقرہ میں ایمان اور اعمالِ صالح کے بعد فرمایا: وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ ...... وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں، تو ان کا اجر اُن کے رب کے ہاں سے ملیگا۔ وہ اجر کیا ہوگا؟ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ٥ (۲/۲۷۷)۔ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔

(۶) اس سے دو ہی آیات پہلے کہا:-

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۲۷۴)

جو لوگ نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے اپنا مال، دن رات، کھلے بندوں اور خاموشی سے، خرچ کرتے ہیں۔ ان کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملتا ہے۔ اور وہ اجر یہ ہوتا ہے کہ نہ کسی قسم کا خوف ان پر مسلّط ہوتا ہے، نہ حزن دامنگیر۔

(۷) قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ مومنانہ زندگی جس کا فطری نتیجہ خوف سے تحفظ اور حزن سے مامونیت ہوتا ہے، کسی ہنگامی پروگرام کا نام نہیں۔ یہ عمر بھر کا اندازِ زیست اور مسلکِ حیات ہے۔ پھر، یہ راہ پھولوں کی سیج نہیں۔ اس میں قدم قدم پر طاغوتی طاقتوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوگا۔ یہ مراحل بڑے صبر آزما اور ہمت طلب ہوں گے۔ اس کے لئے بڑی استقامت کی ضرورت ہوگی۔ فرمایا: إِنَّ

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ..... جو لوگ اس حقیقت کو علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان کا نشو و نما دینے والا، اللہ ہے۔ وہ اس کے لئے کسی انسان کے محتاج نہیں، اور پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں کر تی۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ..... ان پر "ملائکہ" کا نزول ہوتا ہے ــــ ملائکہ نازل ہو کر کیا کرتے ہیں؟ ان سے کہتے ہیں کہ، اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا ..... تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ اس طرح انہیں خوشخبری دیتے ہیں اُس جنت کی جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے: وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (۴۱/۳۰)۔ دوسری جگہ اسی حقیقت کو ذرا اختصار کے ساتھ دہرایا گیا ہے۔ (دیکھئے ۴۶/۱۳)

جنتی زندگی

آگے بڑھنے سے پہلے اس اہم نقطہ پر غور کیجئے کہ جنتی زندگی کی اہم خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا، نہ حزن۔ مکافاتِ عمل کی رُو سے جنہیں جنّت کا مستحق قرار دیا جائے گا ان سے کہا جائے گا کہ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝ (۴۳/۶۸) "اے میرے بندو! اب تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا، نہ حزن۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ ..... (۴۳/۷۰)۔ تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ (نیز ۷/۴۹) وہ اس زندگی میں دِل کی کشادہ سے پکاریں گے:-

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝ (۳۵/۳۴)

وہ اس زندگی کی اندوہ ربا اور طمانیت بخش فضاؤں کو دیکھ کر والہانہ طور پر پکار اٹھیں گے کہ کس قدر درخورِ حمد و ستائش ہے۔ وہ ذات جس نے ہماری پریشانیوں اور افسردگیوں (حزن) کو دُور کر دیا۔ اس قسم کا تحفظ عطا کر دینا اُسی کے لئے ممکن تھا۔ وہ اپنے بندوں کی محنت کا کس قدر بھرپور صلہ دیتا ہے۔

جس زندگی میں نہ خوف ہو نہ ہراس (اندوہ و غم) وہ جنت کی زندگی ہے۔ واضح رہے کہ خوف و حزن سے مامونیت، مومنانہ زندگی کا منتہیٰ نہیں۔ اس میں وہ امن و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جس میں انسانی صلاحیتوں کے نشو و نما پانے کی سعی و کاوش بار آور ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن میں بیان کردہ جنت کی زندگی میں، خوف و حزن سے مامونیت کے بعد بے شمار مثبت نعمائے حیات کا بھی ذکر ہے۔ بالفاظِ دیگر، خوف و حزن سے مامونیت وہ فضا پیدا کرتی ہے جس میں انسانی صلاحیتیں پرورش پاتیں اور برومند ہوتی ہیں۔ یہ اس کے لئے شرطِ لاینفک اور قدمِ اوّل ہے۔ اس جنتی فضا میں پرورش پانے والے سعادت مند اور خوش نصیب

اولیاء اللہ

افراد کو وہ مومن کہہ کر پکارتا ہے اور انہیں "خدا کا دوست" قرار دیتا ہے۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۰/۶۲)۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوتا ہے، نہ حزن۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ جماعتِ مومنین ہی کی ایک صفت ہے۔ قرآن کی رُو سے ہر مومن، ولی اللہ ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کا الگ گروہ، تصوف کا پیدا کردہ تصور ہے۔ قرآن سے اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ قرآنی تعلیم کا ماحصل ایک ایسا معاشرہ پیدا کرنا ہے جس میں کسی کو نہ کسی سے کچھ خوف ہو، نہ حزن۔ قبل اس کے کہ ہم اس موضوع تک پہنچیں کہ خوف اور حزن پیدا کس طرح کیا جاتا ہے اور قرآن، اس سے ماموتیت کا کیا طریق بتاتا ہے، لفظ حُزن کا ایک اور مفہوم ایسا ہے جسے سمجھے بغیر نہ وہ بنیادی سبب سامنے آ سکتا ہے جس کا نتیجہ حزن ہوتا ہے، نہ اس کے ازالہ کی صورت۔

حُزن کا ایک اور مفہوم

عربی لغت میں حزن اس پریشانی کو بھی کہا جاتا ہے جو افلاس اور محتاجی سے پیدا ہو۔ چنانچہ عرب "حزانۃ الرجل" کسی کے ان بیوی بچوں کو کہتے تھے جن کی روٹی کی فکر سے وہ پریشان ہو۔ وہ مزدور جس کے گھر میں رات کی روٹی کا سامان نہ ہو۔ وہ مزدوری کی تلاش میں گھر سے نکلے لیکن اسے کوشش بسیار کے باوجود مزدوری نہ مل سکے۔ وہ جس آتشِ خاموش کو دل میں لئے گھر کی طرف لوٹے گا، اسے حُزن سے تعبیر کیا جائے گا۔ عربی لغت کی مستند کتاب تاج العروس میں ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں اہلِ جنت کے متعلق کہا ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں ان الفاظ میں ہدیۂ تشکر پیش کریں گے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵/۳۴)۔ درخورِ حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے ہمارا حزن دور کر دیا۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ قابلِ حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے ہمیں فکرِ معاش سے نجات دلائی۔ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ٥ (۳۵/۳۵) اس زندگی میں ہمیں نہ حصولِ رزق کے لئے جگر پاش مشقتیں اُٹھانی پڑتی ہیں، اور نہ ہی ذہنی کاوشوں اور نفسیاتی افسردگی کا شکار ہونا پڑتا۔" یہ خصوصیت ہوتی ہے اس معاشرہ کی جو نظامِ خداوندی کی رُو سے قائم ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو بھی ذہن میں رکھئے کہ قرآن کی رُو سے، جنت کی زندگی اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے اور اُخروی زندگی تک ساتھ جاتی ہے۔ اس دُنیا میں جنتی زندگی، نظامِ خداوندی کے زیرِ سایۂ عاطفت حاصل ہوتی ہے۔

(۰)

اب آیئے اس موضوع کی طرف کہ خوف و حزن پیدا کس طرح کیا جاتا ہے، اور قرآن کریم کی رُو سے اس کا علاج کیا ہے؟ آپ عالمِ انسانیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے بالعموم، اور ان اقوام کی تاریخ پر بالخصوص جن کی داستانیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اور جن کا اشاراتی تذکرہ سابقہ صفحات میں سامنے آ چکا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ خوف و حزن پیدا کرنے کے دو ہی ذرائع ہیں۔ جن لوگوں نے کسی طرح اتنی

قوت حاصل کرلی جو عوام کے پاس نہیں تھی، انہوں نے اپنی حکومت قائم کرلی اور عوام کو اپنا محکوم بنالیا۔ اس حکومت کے استحکام اور بقا کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ یعنی عوام پر خوف کی فضا مسلسل طاری رکھنا۔ خوف کی ایسی مسلسل فضا کہ: يَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ... (۱۴/۱۷) "انہیں چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے لیکن وہ مریں نہیں"۔ اگر جابر و جابر ارباب اقتدار خوف کو اس قدر شدید کردیں کہ عوام موت کا شکار ہو جائیں تو پھر یہ حاکم حکومت کس پر کریں؟ اس لئے وہ انہیں زندہ ضرور رکھتے ہیں، اسی طرح جیسے قصاب اپنے بکروں کو زندہ رکھتا ہے۔

ارباب تغلب کا دوسرا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ وسائل رزق کو اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں اور بھوک اور احتیاج کے کوڑے سے "سرکس کے شیر" کو لومڑی بنا دیتے ہیں۔ اس طرح خوف اور حزن کی فضا کو مسلسل قائم رکھتے ہیں۔ قرآن کریم نے استبداد اور استحصال دونوں کے لئے فرعون مصر کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ اس کی مملکت میں ــــــ خوف کی جو کیفیت تھی اس کے متعلق ہم سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔ خود حضرت موسیٰؑ کی قوم (بنی اسرائیل) اس کے خوف کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر لبیک نہیں کہتی تھی۔ (عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ ... ۱۰/۸۳)۔ دوسری طرف، جب خود اس کی قوم کے پروہتوں نے، جو اس معاشرہ میں بلند ترین مقام پر فائز ہوتے تھے، حضرت موسیٰؑ کی صداقت کو تسلیم کرلیا تو فرعون کے قہر اور غضب نے جو طوفان برپا کیا، اسے بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔

جہاں تک رزق کے سرچشموں پر اقتدار کا تعلق ہے، جب فرعون کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ عوام حضرت موسیٰؑ کی دعوت سے متاثر نہ ہو جائیں، تو اس نے ملک میں اعلان کیا کہ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (۴۳/۵۱)۔ "اے لوگو! سوچو کہ کیا اس ملک کی زمینیں اور ان میں بہنے والی نہریں، میری ملکیت نہیں ہیں؟ .... ذرا عقل و ہوش سے کام لو کہ اگر میں نے رزق کے یہ دروازے تم پر بند کر دیئے تو تمہارا حشر کیا ہوگا؟ أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ ۝ (۴۳/۵۲)۔ اس مفلس و قلاش کے پاس ہے کیا جو تمہیں میرے خلاف اکسا رہا ہے۔ اسے تو سلیقے سے بات بھی کرنی نہیں آتی! أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (۷۹/۲۴) تمہارا رزق میرے ہاتھ میں ہے۔ میں تمہارا "ان داتا" ہوں۔ یہ ہوتے ہیں ارباب تغلب و استبداد کے وہ حربے جن سے ملک میں خوف و ہراس کی فضا قائم رکھتے ہیں اور عوام کے جوہر انسانیت کو کچل کر رکھ دیتے ہیں کہ وہ اٹھنے نہ پائیں۔

ــــــ(۰)ــــــ

محکومی سے نجات

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یہ تھی عالمگیر انسانیت کی حالت جب اسلام کا ظہور، یعنی قرآن کا نزول اور حضور نبی اکرمؐ کی بعثت ہوئی۔ اس نے حضورؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ: وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي

كَانَتْ عَلَيْهِمْ .... (۷/۱۵۷)۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں نوعِ انسان جکڑے چلی آ رہی تھی اور ان بھاری بھرکم سلوں کو ان کے سر سے اتار پھینکے گا جن کے تلے وہ دبی ہوئی تھی۔ اس نے اسلام کا مقصود و منتہیٰ دو لفظوں میں بیان کر دیا۔ فَكُّ رَقَبَةٍ .... (۹۰/۱۳) وہ نوعِ انسان کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالے گا۔

اس مقام پر ایک اور نکتہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔ خوف تو محسوس اسباب کا پیدا کردہ ہوتا ہے اس لئے اس کا سمجھ لینا مشکل نہیں۔ حزن سے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ محسوس نہیں ہوتے۔ آج کی اصطلاح میں آپ انہیں (PSYCHOLOGICAL COMPLEXES) کہہ سکتے ہیں۔ لیکن زمانہ نزولِ قرآن میں نہ نفسیاتی امراض کی طرف کسی کا خیال گیا تھا۔ نہ ہی ان کے لئے کوئی اصطلاحات وجود میں آئی تھیں۔ یہ قرآن کا اعجاز اور بلاغت ہے کہ اس نے ان امراض کو "دل کے روگ" کہہ کر پکارا ہے جب کہا کہ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ .... (۲/۱۰) اور قرآن کے متعلق کہا کہ وہ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ .... (۱۰/۵۷) ہے۔ یعنی دل کے امراض کو شفا بخشنے والا۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو قرآن نے خوف اور حزن، دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ ویسے حزن (یا دل کے روگ) بھی خوف ہی کے پیدا کردہ احساسات ہوتے ہیں جو تحت الشعور میں چھپے رہتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے خوف کے شجرۃ الزقوم کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جب کہا کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ لَا إِلٰهَ کے معنی ـــــ یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی انسان صاحبِ اقتدار نہیں ہو سکتا۔

اس سے سوال پیدا ہوا کہ حکومت کے بغیر انسانی معاشرہ قائم کیسے رہ سکے گا؟ اس سے تو فوضویت (انارکی) پھیل جائے گی۔

نظامِ حکومتِ خداوندی

کہا کہ حکومت تو ہوگی لیکن اس میں حکمرانی قانون کی ہوگی۔ کسی انسان کی نہیں ہوگی۔

سوال پیدا ہوا کہ ہم نے قانون کی حکمرانی کو بھی دیکھ لیا ہے۔ اس میں بھی خوف اور حزن کے اسباب کی کمی نہیں ہوتی۔ اس میں ایک شخص یا چند اشخاص کے فیصلوں کو قانون کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اور ان کی خلاف ورزی کی پاداش میں ایسی لرزہ انگیز سزائیں رکھی جاتی ہیں جن سے معاشرہ پر خوف طاری رہے۔ اور چونکہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کل کو کس قسم کا قانون نافذ کر دیا جائے اور اس کی گرفت میں کون کون آ جائے، یا اسے کونسی پچھلی تاریخ سے نافذ کر دیا جائے۔ اس سے ہر شخص کے اعصاب پر حزن مسلط رہتا ہے۔ قانون کی حکمرانی میں، بہترین طریق مغرب کا جمہوری نظام قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں اکثریت کے ہاتھوں اقلیت کا جو حشر ہوتا ہے اس پر ان ممالک کے اربابِ دانش کی آہ و پکار شاہد ہے۔ لہٰذا، قانون کی حکمرانی میں خوف اور حزن سے مامونیت کس طرح حاصل ہو جائے گی؟

جواب دیا کہ اس میں قوانین، انسانوں کے وضع کردہ نہیں ہوں گے۔ خود خدا کے متعین فرمودہ ہوں گے جنہیں اس نے اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ لہٰذا، اس نظامِ حکومت میں، حکمرانی کتاب اللہ کی ہوگی۔ ان قوانین کی خصوصیت یہ ہوگی کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔ یہ مکمل بھی ہوں گے اور غیر متبدّل بھی۔ (۶/۱۱۶)

ان قوانین کی عام اشاعت کر دی جائے گی اور ہر ایک سے کہہ دیا جائے گا کہ وہ انہیں اچھی طرح سمجھ کر فیصلہ کرے کہ وہ ان کے تابع زندگی بسر کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اس میں کسی قسم کا جبر اور جور نہیں ہوگا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) کا یہی مطلب ہے۔ جو ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں گے وہ جماعتِ مومنین کے افراد کہلائیں گے۔ اس نظام کا قیام و استحکام اور نظم و نسق انہی کے ذمے ہوگا۔ جو ایسا نہیں چاہیں گے انہیں اجازت ہوگی کہ وہ چاہیں تو کسی اور ملک کی طرف چلے جائیں اور چاہیں تو، ان شرائط کے مطابق جو انہیں واضح طور پر بتا اور سمجھا دی جائیں گی۔ اسی مملکت میں رہیں۔ خوف اور حزن سے مامونیت کی ضمانت انہیں بھی دی جائے گی۔ ان کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت کی حفاظت قرآنی مملکت کے ذمہ ہوگی (اسی اعتبار سے انہیں ذمّی کہا جاتا ہے) الدین (قرآنی نظام) تو انہوں نے اختیار نہیں کیا تھا، لیکن انہیں ان کے مذہب کی آزادی ہوگی —— مذہبی اعتقادات۔ پرستش کے رسوم و مناسک وغیرہ۔ ان کے معابد کی حفاظت بھی اس مملکت کی ذمہ داری ہوگی۔ اس لحاظ سے آپ نے دیکھا کہ اس مملکت میں خوف و حزن کسی کو بھی نہیں ہوگا —— نہ مسلموں کو نہ غیر مسلموں کو۔

اس مقام پر ایک اور سوال پوچھا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآنی احکام، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی، عطا فرمائے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے غیر متبدل ہیں کہ انہیں کوئی انسان تبدیل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ انہیں کسی وقت خود خدا بذریعہ وحی تبدیل کر دے!

اس سوال کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ اس وقت آپ کو اختیار ہوگا کہ جی چاہے تو ان تبدیل شدہ احکام کو تسلیم کریں، اور جی چاہے تو ان سے انکار کر کے غیر مسلموں کے زمرے میں شمار ہو جائیں۔

ختمِ نبوّت

لیکن اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ جس خدا نے خوف و حزن سے مامونیت کی ضمانت دی ہے اسی نے یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا، قرآنی احکام، قیامت تک کے لئے غیر متبدّل رہیں گے۔ ختمِ نبوّت درحقیقت انسانی حریت اور آزادی کا عظیم انقلاب آفریں اعلامیہ ہے۔ علامہ اقبالؒ اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اسلام کا ظہور استقرائی فکر (INDUCTIVE INTELLECT) کا ظہور ہے۔
اس میں نبوّت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس کی تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت

کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لئے عہدِ طفولیت کی ڈوریوں سے باندھے نہیں رکھا جا سکتا۔ انسان کو شعورِ خویش کی منزل تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے اس کی اپنی صلاحیتوں کے سہارے پر چھوڑ دیا جائے اسلام نے مذہبی پیشوائیت اور موروثی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن مجید غور و فکر اور تجربات و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علمِ انسانی کے ذرائع ٹھہراتا ہے یہ سب ختمِ نبوت کے نظریہ ہی کے مختلف گوشے ہیں ..... عقیدۂ ختمِ نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اب نوعِ انسان کی تاریخ میں کوئی شخص اس کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی فوق الفطرت اتھارٹی کی بناء پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ ایک ایسی نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوائے اقتدار کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ (پانچواں خطبہ۔ صفحہ ۱۲۰)

وہ اپنے چھٹے خطبہ کے خاتمہ پر کہتے ہیں:-

اس عقیدہ کی حامل قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ (صفحہ ۱۷۱)

اس میں یہ کہا گیا ہے۔ اور یہ درحقیقت قرآن ہی کا اعلان ہے کہ ختمِ نبوت، انسانی حریت (آزادی) کا منشور ہے۔ اس پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جماعتِ مومنین نے جب قرآنی احکام کا اتباع کرنا ہے جو ابدی اور غیر متبدل ہیں، تو اسے آزادی کس طرح کہا جائے گا؟

یہ سوال، قرآنی احکام کی حقیقت سے ناواقفیت سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں (بجز چند احکام) اصول و اقدار دیئے ہیں۔ امتِ مسلمہ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان اصول و اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی قوانین خود وضع کرے۔ بالفاظِ دیگر، یوں کہیئے کہ قرآنی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ امت کے مشورہ سے، ان اصول و اقدار کے نافذ کرنے کے طریق وضع کرے۔ انہیں شریعتِ اسلامیہ کہا جائے گا۔ یہ قرآنی اصول و اقدار، غیر متبدل رہیں گے اور امت کے وضع کردہ جزئی احکام یا طور طریق حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے۔ لفظ شریعت کے معنی ہیں ایسا راستہ جو اس ندی کی طرف لے جائے جو رواں دواں (بہنے والی) ہو۔ مغربی جمہوریت اور قرآنی نظام میں یہ بنیادی فرق ہے۔ مغربی جمہوریت میں مقننہ کے قانون سازی کے اختیارات غیر محدود ہوتے ہیں۔ یعنی وہ جس قسم کے قانون چاہے وضع اور نافذ کرے۔ اسی لئے اس میں خوف اور حزن کا امکان مضمر ہوتا ہے۔ قرآنی نظام میں امت کی مشاورت محدود ہوتی ہے قرآنی اصول و اقدار سے۔ یعنی وہ کوئی ایسا قانون مرتب نہیں کر سکتی جو قرآنی حدود سے متصادم یا متجاوز ہو۔ اس لئے ان قوانین میں خوف یا حزن کا امکان نہیں ہوتا۔

واضح رہے کہ مشاورت کا حکم وقتی یا ہنگامی نہیں۔ یہ قرآن کے ابدی، غیر متبدل اصولوں میں سے ہے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ حضورؐ کو بھی اس کا حکم دیا گیا تھا۔ (۳/۱۵۸) امت کے

متعلق جو کہا گیا کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ...... (۴۲/۳۸) "ان کے امورِ مملکت باہمی مشورہ سے طے ہوں گے" تو قرآنی نظام کی یہ شرط ہنگامی یا وقتی نہیں۔ قرآن کے دیگر اصولوں کی طرح، یہ ابدی اور غیر متبدل ہے۔ نظامِ مملکت سے متعلق کسی معاملہ میں بھی اگر مشاورت نہیں، تو وہ فیصلہ اسلامی نہیں ہوگا۔ اور یہ واضح ہے کہ جب امر مشروط ہے مشاورت سے، تو سربراہِ مملکت (امیر المؤمنین) کا تقرر بدرجۂ اولیٰ مشاورت سے مشروط ہوگا۔ ملوکیت، موروثی سلطنت یا آمریت اور قرآنی نظام میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ ...... قرآنی نظام میں سربراہ کے تقرر کے لئے مشاورت شرط ہے۔ اگر سربراہِ مملکت کا تقرر ہی قرآنی شرط پر پورا نہیں اترتا تو مملکت کا کوئی کاروبار اسلامی قرار نہیں پا سکتا، خواہ وہ قرآنی احکام کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ کسی قانون کے اسلامی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہو، اور کسی مملکت کے اسلامی ہونے کی اساس و بنیاد یہ ہے کہ اس کا تمام کاروبار کتاب اللہ کے مطابق ہو۔ اس میں سربراہ کا تقرر خشتِ اوّل ہے۔ اگر خشتِ اوّل (بنیاد کی اینٹ) ہی ٹیڑھی ہے تو اس پر اٹھی ہوئی دیوار کس طرح سیدھی ہوگی۔

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج ! !

قرآن کریم نے مشاورت کا اصول دیا ہے۔ اس کا طریق خود متعین نہیں کیا۔ یہ طریقہ، حالات کے مطابق اُمّت خود طے کرے گی۔ یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کی رو سے، مملکت کسی خاص فرد، یا خاص گروہ کی ملکیت نہیں ہوتی۔ یہ پوری اُمّت کا قائم کردہ نظام ہوتا ہے۔ (علاوہ دیگر آیات) خود اَمْرُهُمْ میں هُمْ کی ضمیر ساری اُمّت کے لئے ہے۔

جب نظامِ مملکت میں ساری اُمّت شریک ہوگی اور اس نظام کا کاروبار ان کے باہمی مشورہ سے سرانجام پائے گا، تو اس میں خوف و حزن کا امکان نہیں ہوگا جو انسانوں کے خودساختہ نظامِ مملکت کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس میں ایک بڑھیا بھی سربراہِ مملکت سے بے باکانہ کہہ سکے گی کہ فلاں فیصلہ پر نظرِ ثانی کیجئے کیونکہ وہ قرآن کے خلاف نظر آتا ہے۔ اور ایک لونڈی (اور تو اور) رسول اللہؐ سے پورے اطمینان اور سکونِ قلب سے کہہ سکے گی کہ آپ کا یہ مشورہ اگر خدا کا حکم ہے تو سرِ تسلیم خم ہے۔ اور اگر آپ کا ذاتی مشورہ ہے تو مجھے اس کی تعمیل سے معاف رکھئے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ مشاورت کا حکم وقتی یا ہنگامی نہیں۔ یہ ابدی حکم ہے جس کا اطلاق ہر زمانے کی اسلامی مملکت پر یکساں ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی سابقہ زمانے کی اسلامی مملکت کے، مشاورت کی رُو سے طے شدہ جزئی قوانین اُس زمانے کے لئے شرعی احکام کہلا سکیں گے۔ آنے والے زمانے کی اسلامی مملکت پر ان کی پابندی لازم نہیں ہوگی۔ وہ خود اپنے طریقِ مشاورت سے ان احکام کو وضع اور نافذ کرے گی۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو کسی سابقہ زمانے کے فقہی احکام، آنے والے زمانے کے لئے، غیر متبدل احکامِ شریعت قرار نہیں پا سکتے۔ یوں بھی، قرآن کریم نے صرف کلمات اللہ (خدا کے احکام) کو

غیر متبدّل کہا ہے۔ اگر انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدّل سمجھ لیا جائے تو یہ انہیں خدائی صفت سے متصف کر دینے کے مرادف ہوگا جو شرک ہے۔ جہاں تک متداول فقہی احکام کا تعلق ہے، یہ تو کسی اسلامی مملکت میں مشاورت کی رو سے مرتب بھی نہیں ہوتے تھے۔ یہ دورِ ملوکیت میں، بعض قانون دان حضرات نے اپنی صوابدید کے مطابق مرتب کئے تھے۔ یہ اس اعتبار سے بھی ہمارے دور میں اسلامی نہیں کہلا سکتے۔ ہمارے دور میں اسلامی احکام اس طرح مرتب ہوں گے کہ

(۱) سب سے پہلے مملکت اسلامی ہو۔ یعنی وہ اعلان کرے کہ اس کا سب کاروبار کتاب اللہ کے مطابق ہوگا۔

(۲) اس کی مشاورتی تنظیم، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے لئے طریق وضع کرے گی۔ یہ جزئی قواعد ہمارے لئے احکامِ شریعت قرار پائیں گے۔ چونکہ یہ ہمارے اپنے وضع کردہ ہوں گے اور جن اسباب و وجوہ کی بنا پر انہیں وضع کیا جائے گا، وہ بھی ہمارے سامنے ہوں گے، اس لئے ان سے خوف و حزن پیدا نہیں ہوگا۔ ہزار سال پہلے کے قانون دان حضرات کے وضع کردہ فقہی احکام کو احکامِ شریعت کی حیثیت سے نافذ کر دینے کا جو نتیجہ ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

(۰)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ خوف اور حزن سے مامونیت صرف اس نظام میں ممکن ہے جس کا تمام کاروبار خالص کتاب اللہ کے مطابق ہو۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اگر اس میں انسانوں کے خود ساختہ نظریات و قوانین کی ذرا سی بھی آمیزش ہو گئی تو وہ شرک ہو جائے گا۔ خدا اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ..... (۱۸/۲۶)۔ وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے اسوہ کو ایک توحید پرست کی حیثیت سے بطورِ مثال پیش کیا ہے۔ وہ (نمرود جیسے) سراپا قہر و استبداد بادشاہ کو انتہائی جرأت و بیباکی سے متنبہ کرتے ہیں کہ تمہارا مسلک باطل ہے۔ اسی طرح وہ اپنی قوم سے برملا کہتے ہیں کہ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ ..... (۶/۸۲) تم جنہیں شریکِ خدائی ٹھہراتے ہو، میں ان سے کیوں خوف کھاؤں۔ خائف تو تمہیں ہونا چاہیئے جو خدا کے

شرک میں خوف

ساتھ اوروں کو بھی شریک کرتے ہو۔ اس کے بعد فرمایا فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ..... (۶/۸۲) تم سوچو کہ تم میں اور مجھ میں سے، کسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ اسے کسی کا ڈر نہیں۔ وہ کامل امن کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرک کا لازمی نتیجہ خوف ہے۔ اسی بنا پر اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

ہر کہ رمزِ مصطفٰےؐ فہمیدہ است!
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

(رموزِ بیخودی ص۱۱۱)

اسے اچھی طرح سمجھ رکھئیے کہ شرک کے معنی ہیں انسانوں کی حکومت خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔ اور اس کا نتیجہ ہے خوف۔ اس سے انسان کس قدر پستیوں میں جا گرتا ہے اسے تشبیہاً سمجھانے کے لئے کہا کہ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ ..... (۲۲/۳۱) جو اللہ کے حق حکومت میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کوئی شخص آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آ گرے۔ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ پھر اسے کوئی چیل اُچک کر لے جائے۔ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲/۳۱) یا جیسے گھاس کا کوئی تنکا ہو جسے تند و تیز ہوا اِدھر اُدھر اڑائے لئے پھرے اور کسی دور دراز مقام پر لے جا کر پھینک دے۔

آپ غور کیجئے کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی محکومیت اختیار کرنے والوں کا کس قدر عبرتناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا۔۔ ہم تو چاہتے تھے کہ یہ ہمارے نظام کے تابع زندگی بسر کرکے آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے۔ وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ ..... (۷/۱۷۶) لیکن یہ شرک اختیار کرکے زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک گیا۔ یعنی انسانوں کی محکومیت اختیار کرکے انسان، شرف و احترامِ آدمیت کا مقام کھو بیٹھتا ہے اسی لئے فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ..... (۴/۱۱۶) خدا کے قانون کی مشیت کی رُو سے انسان کی ہر لغزش کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص انسانوں کی محکومیت اختیار کرکے اپنا مقام ہی کھو بیٹھے، اس کا ازالہ خدا بھی نہیں کرتا۔ اسی لئے شرک کو ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔ (۳۱/۱۳)۔ ظلم کے معنی ہیں جس چیز کو جس مقام پر ہونا چاہئیے اس کا اس مقام پر نہ ہونا۔ محکومیت کی ان پستیوں میں گر کر انسان کا سینہ جس خوف اور حزن کا نشیمن بنا رہتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قرآنِ کریم نے فرقہ پرستی کو اسی لئے شرک کہا ہے کہ (۳۰/۳۲) اس میں انسان کتاب اللہ کی اطاعت کے بجائے، انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت کرتا ہے۔ فرقہ قائم ہی شخصیت پرستی کی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ شخصیتوں کو درمیان سے نکال کر براہِ راست کتاب اللہ کے ساتھ متمسک ہو جائیے، فرقوں کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اسی کو اسلامی نظام کہا جائے گا۔

قرآنِ کریم نے انسان کا سب سے بڑا شرف یہ بتایا ہے کہ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ شرک میں انسان، اپنے اختیار و ارادہ کو دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے، یا یوں کہئیے کہ مستبد اربابِ اقتدار اس کے اختیار و ارادہ کو سلب کر لیتے ہیں۔ اس طرح وہ شرفِ انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ اس میں جرأت و بیباکی کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے، وہ اپنی ذمہ داریوں کا سامنا کرنے سے جی چراتا ہے۔ وہ اپنے فیصلوں اور اقدامات کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے، اپنے آپ کو مجبور قرار دیتا ہے۔ سورۂ نحل میں ہے کہ: وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ..... (۱۶/۳۵)۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے جو غیر اللہ کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے، تو اس کے لئے ہم مجبور ہیں۔ یہ سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ چاہتا تو ہم ان کی محکومیت

کبھی اختیار نہ کرتے۔

اس مقام پر پہنچ جاتا ہے انسان شرک سے ـــــ ارباب اقتدار یہ کہہ کر اپنے ظلم و استبداد کے الزام سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اللہ کی مرضی سے کرتے ہیں۔ اسی نے ہمیں یہ اقتدار دیا ہے اور اسی کے حکم سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ دوسری طرف ان کے مطیع و فرمان پذیر یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ ہم جو ان کی محکومیت اختیار کرتے ہیں تو یہ اللہ کی مرضی ہے۔ ہم اس میں مجبور ہیں۔

عقیدۂ جبر وضع کردہ ہی مستبد انسانی حکومتوں کا ہے۔ انہیں یہ بہت (SUIT) کرتا ہے۔ "ہم ظلم نہیں کرتے۔ خدا کا حکم ہی ایسا ہے۔" "ہم ظلم نہیں سہتے، خدا کی مرضی ہی ایسی ہے۔" ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ۔۔۔۔ (۲۲/۷۳)۔ حاکم و محکوم دونوں جرأت سے عاری ہیں کہ مردانہ وار اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کریں۔ ان (نام نہاد) خدا پرستوں سے تو وہ ملحد و بے دین ہزار بار اچھے ہیں جو ظلم و زیادتی کرتے ہیں تو دھڑلے سے کہتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں۔ وہ اپنی چیرہ دستیوں کے لئے خدا کو سپر نہیں بناتے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ استبداد کا نتیجہ خوف وحزن اور مفلسی و محتاجی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے عذاب سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ نحل میں اس کی وضاحت ایک مثال سے کی گئی ہے۔۔۔۔

بھوک اور خوف عذاب ہیں

فرمایا: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ ۔۔۔۔ (۱۶/۱۱۲) اللہ ایک ۔۔۔۔ بستی کی مثال دیتا ہے۔ اسے امن بھی نصیب تھا اور اطمینان بھی۔ یعنی انہیں نہ خوف تھا نہ حزن۔ ان کی طرف چاروں طرف سے رزق بافراط کھنچے چلا آتا تھا یہ نتیجہ تھا ان کے صحیح نظام کا، فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ ۔۔۔۔ انہوں نے اپنے ربوبیت عامہ کے نظام کو بدل ڈالا۔ نعماء خداوندی کی ناسپاس گذاری کی۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا امن بھی چھن گیا اور رزق بھی۔ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں ماخوذ ہو گئی۔ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○ (۱۶/۱۱۲)۔ یہ نتیجہ تھا ان کے خود ساختہ نظام کا۔

یہ عذاب دفع کس طرح ہوتا ہے؟ حکومت خداوندی قائم کرنے سے۔ سورۂ النور میں اس حکومت کے قیام اور اس کے ثمرات کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے ان تمام مقامات کی وضاحت ہو جاتی ہے جو سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے ہیں۔ فرمایا:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص ۔۔۔۔ (۲۴/۵۵)

ہم نے ان لوگوں سے، جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اسی دنیا میں

حکومت عطا کریں گے جس طرح ہم نے اپنے اسی اصول کے مطابق اقوامِ سابقہ کو بھی اسی قسم کی حکومت (تمکن) عطا کی تھی۔

آیت کے اتنے حصّے سے جو حقائق سامنے آتے ہیں، سردست انہی کو پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جہاں جہاں خدا نے کہا ہے کہ ہم نے وعدہ کر رکھا ہے (یا یہ ہمارا وعدہ ہے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خدا کا قانون ہے جس کا نتیجہ اٹل ہے۔ ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے، یہ خدا کا ابدی قانون ہے۔ اسی قانون کے مطابق بنی اسرائیل کو حکومت اور مملکت عطا ہوئی تھی (وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ.... ۷/۱۲۹) اسی کی رُو سے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت کے علاوہ ملکِ عظیم عطا ہوا تھا۔ (۴/۵۴)۔ انہی معنوں میں حضرت داؤدؑ خلیفہ فی الارض (۳۸/۲۶) تھے، اور یہ استخلاف فی الارض اس لئے عطا ہوا تھا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ.... (۳۸/۲۰) وہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ وحی خداوندی کے مطابق کر سکیں۔

ہمارے دور کے بعض مدعی (غلامی اور محکومی کے انسانیت کش جراثیم جن کی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر چکے ہیں) کہا کرتے ہیں کہ آیت (۲۴/۵۵) میں جس خلافت فی الارض کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ "روحانی خلافت" ہے۔ جو انگریز کی غلامی میں بھی حاصل ہو سکتی تھی۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ الدّین (اسلام) میں روحانی اور مادی میں ثنویت ہوتی ہی نہیں۔ ہر مادی کام جو قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے، "روحانی" ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ نے اسلام کی اس خصوصیت کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

از کلیسا دیں، در دنیا کشاد

وہ (اسلام) دنیا کے ہر دروازے کو دین کی چابی سے کھولتا ہے۔ لہٰذا، مادی حکومت کو چھوڑ کر "روحانی خلافت" کو دین کا مقصود سمجھ لینا فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔

قرآنِ کریم نے تاریخی شواہد (اقوامِ سابقہ کی مثال) سے خود ہی واضح کر دیا کہ استخلاف فی الارض سے مراد کیا ہے۔ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں تو الفاظ بھی یہی آئے ہیں (۷/۱۲۹) دوسری جگہ ان کی تفسیر ان الفاظ سے کر دی کہ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا..... (۷/۱۳۷) "ہم نے اس قوم کو جسے فرعون کی چیرہ دستیوں نے کچل کر رکھ دیا تھا، اس ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا مالک بنا دیا" دوسری جگہ ہے کہ قومِ فرعون کو اس ملک کے باغات، چشموں، خزائن اور بلند و بالا مقامات سے نکال کر بنی اسرائیل کو ان کا مالک بنا دیا۔ (۲۶/۵۷-۵۹) سورۂ قصص میں ہے: وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۙ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ.... (۲۸/۵-۶) ہم نے بنی اسرائیل کو ان ممالک کا وارث (مالک) بنا دیا اور اس طرح انہیں وہاں تمکن عطا کر دیا۔ اور یہی الفاظ جماعت مومنین کے متعلق آئے ہیں جن سے (ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجے میں) استخلاف فی الارض کا وعدہ کیا تھا۔ فرمایا: وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا

(۳۳/۲۷) خدا نے تمہیں تمہارے مخالفین کی زمینوں کا۔ ان کے شہروں کا۔ ان کے مال و دولت کا مالک بنادیا۔ اور ان زمینوں کا بھی جن پر تمہارا قبضہ بعد میں ہونے والا تھا۔

ان شواہد سے واضح ہے کہ جس استخلاف فی الارض کو ایمان وعمل صالح کا فطری نتیجہ بتایا گیا ہے اس سے مراد مملکت اور حکومت ہے۔

(۲) یہیں سے ہمارے سامنے یہ حقیقت بھی آگئی کہ حکومتِ خداوندی یا اسلامی مملکت کسے کہا جائے گا! مملکت اور حکومت تو بزورِ شمشیر ہلاکو اور چنگیز نے بھی حاصل کر لی تھی، اور شاہنشاہوں کے ولی عہد اسے وراثتاً۔۔۔ بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ (اسے موروثی ملوکیت کہا جاتا ہے!) کیا اسے بھی خدا کی طرف سے عطا کردہ استخلاف فی الارض کہا جائے گا اور اس کے سربراہوں کو ایسے اربابِ اقتدار جو منشائے خداوندی کو پورا کرنے کے لئے مامور ہوتے ہیں؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ!۔۔۔

اسلامی حکومت

اگر ایسا ہی ہو تو صاحبِ ضربِ کلیمی کو فرعون کی کلائی مروڑنے کے لئے کیوں بھیجا جاتے؟ حکومت وہی منشاءِ خداوندی کے مطابق (یعنی اسلامی) قرار پا سکتی ہے جو ایمان و اعمالِ صالح کی رو سے قائم کی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی مملکت ان افراد کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے جو اپنی زندگی اقدارِ خداوندی کے حدود کے اندر رہتے ہوئے گذاریں اور ان کی سیرت و کردار، قرآنی اقدار کے سانچے میں ڈھلی ہو۔ اس مملکت کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس قسم کے افراد تیار کئے جائیں۔ جیسا کہ حضور نبی اکرمؐ نے مکی زندگی میں کیا۔ مدنی مملکت انہی کے ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ تھی۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی خطۂ زمین مل جائے جس میں اس قسم کی مملکت قائم کی جاسکتی ہو، تو جب تک اس کی زمامِ اقتدار ایسے افراد کے ہاتھوں میں نہیں آئے گی جو سیرت و کردار کی رو سے قرآنی معیار پر پورے اتریں اور اس کا کاروبار کتاب اللہ کے مطابق ہو، اسے اسلامی مملکت نہیں کہا جائے گا۔ وہ دنیا کی دیگر مملکتوں کی طرح ایک مملکت ہوگی۔ موروثی ملوکیت یا بزورِ شمشیر حاصل کردہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ صدرِ اوّل کے بعد، ہماری تاریخ میں آج تک کسی مملکت کو بھی اسلامی مملکت نہیں کہا جاسکتا۔

(۳) یہ تو رہا یہ سوال کہ ایسی مملکت قائم کس طرح کی جاتی ہے؟ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ مملکت مقصود بالذات ہوتی ہے یا کسی بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ؟ قرآنِ کریم اس سوال کا متعین جواب دیتا ہے کہ یہ مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس مقصد کو اس نے یہ کہہ کر واضح کر دیا: وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ ..... (۲۴/۵۵) وہ مقصد یہ ہے کہ جس دین کو خدا نے تمہارے لئے متعین (پسند) کیا ہے اسے تمکن حاصل ہو جائے ـــــ دین کا تمکن اس مملکت کے قیام کا مقصد، علتِ غائی بلکہ وجہِ جواز ہے۔ اس سے واضح ہے کہ

(۱) اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین کو تمکن حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور

(۲) جس مملکت میں دین کو تمکن حاصل نہیں، وہ اسلامی نہیں کہلا سکتی۔
ضمناً۔ تحریک پاکستان کے دوران، نیشنلسٹ علماء کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کی سیکولر حکومت میں بھی اسلام پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے مسلمانوں کی الگ آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ اس کے جواب میں، ہم (علاوہ دیگر دلائل و شواہد) اس آیت کو بطور دلیل اور سند پیش کیا کرتے تھے (کہ اپنی مملکت کے بغیر دین کو تمکن حاصل نہیں ہو سکتا)۔ ان سے ان کا کوئی جواب بن نہیں پڑتا تھا۔ ان کی غلط نگہی یہ تھی کہ وہ اسلام کو ایک مذہب سمجھتے تھے۔ دین نہیں۔
اسی بناء پر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اور یہ قرآن کریم کے اس ارشاد کی تشریح تھی جس کی رو سے اس نے نماز، روزہ کو بھی دین کے تمکن سے مشروط قرار دیا ہے۔ اس نے جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ...... (۲۲/۴۱)۔ "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلوٰۃ۔ ایتائے زکوٰۃ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے"......
اسلامی مملکت کے بغیر تو صلوٰۃ اور زکوٰۃ جیسے احکام پر بھی منشائے خداوندی کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا۔ ان کی حیثیت مذہبی رسوم کی سی رہ جاتی ہے۔
لہٰذا، جہاں تک شق دوم کا تعلق ہے، اسلامی مملکت کا مقصد دین کا تمکن ہے، مذہب کا نفاذ نہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ جس غلط نگہی نے تحریک پاکستان کے دوران دین اور مذہب میں تصادم پیدا کر دیا تھا، وہی غلط نگہی اب پاکستان میں عام ہو رہی ہے۔ یہاں مذہبی احکام نافذ کئے جاتے ہیں اور انہیں اسلامی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہاں مذہب کے اجارہ دار وہی حضرات ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی اور جو اسلام کو ایک مذہب سمجھتے تھے۔ وہ یہاں بھی اسے مذہب ہی کی حیثیت سے رائج کرنا چاہتے ہیں کیونکہ مذہبی پیشوائیت کا وجود اسی سے قائم رہ سکتا ہے۔
(۳) اب آگے چلئے۔ مملکت بھی قائم ہو گئی۔ دین کو تمکن بھی حاصل ہو گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ فرمایا کہ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے:-

وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا...... (۲۴/۵۵)
تاکہ اُن کا خوف امن سے بدل جائے۔

آپ نے غور فرمایا کہ حکومت خداوندی کے قیام اور دین کے تمکن کا ماحصل کیا ہے؛ یہ کہ کسی کو کسی قسم کا خوف نہ ہو۔ اس سے ہمارے سامنے ایک ابدی کسوٹی آ گئی جس پر پرکھ کر دیکھا جا سکتا ہے کہ کوئی

مملکت اسلامی ہے یا نہیں۔ اگر وہ مملکت ایسی ہے جس میں کسی کو کسی قسم کا خوف نہیں تو وہ اسلامی ہے۔ اگر افرادِ مملکت خوف و حزن کا شکار ہیں تو مملکت غیر اسلامی ہے اور اس کی حکومت فرعونی۔

(۴) اگلا سوال یہ سامنے آیا کہ امن کی یہ کیفیت پیدا کس طرح ہوتی ہے؟ اس کا جواب وہی ہے جس سے ہم نے آغازِ کلام کیا ہے؟ یعنی یہ کہ

یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡـًٔا ؕ .... (۲۴/۵۵)

اس مملکت میں حکومت صرف خدا (کی کتاب) کی ہوگی۔ اس کے ساتھ کچھ نہیں ملایا جائے گا کیونکہ ایسا کرنا شرک ہے۔

بات سمٹ سمٹا کر وہیں آگئی کہ خوف اسی صورت میں مٹ سکتا ہے کہ حکمران صرف کتاب اللہ کی ہو۔ اگر کتاب اللہ کے ساتھ کچھ اور ملا دیا، تو یہ شرک ہوگا اور اس کا نتیجہ خوف۔ جو کچھ کتاب اللہ کے ساتھ ملایا جائے گا وہ لامحالہ انسانوں کا وضع کردہ ہوگا، خواہ وہ انسان سامنے موجود ہوں، اور خواہ کسی سابقہ زمانے میں گذر چکے ہوں۔ اسلام کے منشور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (کوئی صاحبِ اقتدار نہیں سوائے اللہ کے) میں اربابِ سیاست بھی آجاتے ہیں اور اعیانِ مذہب بھی..... خواہ وہ دورِ حاضر سے متعلق ہوں اور خواہ ماضی کے دور سے۔ یہ سب اٰلہٰ غیر اللہ ہیں جن کی اطاعت شرک ہے۔

اس مقام پر مجھے ایک ذاتی واقعہ یاد آگیا جسے میں نے شاید پہلے بھی کبھی بیان کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں دہلی میں پہلے پہل ریڈیو نصب ہوا تو انہیں عید الاضحٰی کی تقریب پر تقریر نشر کرنے کے لئے کسی موزوں مقرر کی تلاش ہوئی۔ اسلامی حلقے میں میری کافی شہرت تھی لہٰذا انہوں نے اس مقصد کے لئے میرا نام تجویز کیا۔ لیکن میں سرکاری ملازمت سے منسلک تھا، اس لئے سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا سرکاری ملازمین کو ریڈیائی تقریریں نشر کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہ سوال اصولی طور پر ہوم ڈیپارٹمنٹ میں بھیجا گیا جس سے میں خود منسلک تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ تم جس موضوع پر تقریر کرنا چاہتے ہو، اس کا ملخص کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ قربانی کی عید کی تقریب ہے۔ میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ پیش کروں گا اور بتاؤں گا کہ انہوں نے شرک کی کس قدر مخالفت کی تھی۔ چونکہ یہ سوال اصولی تھا اور پہلے پہل زیرِ غور آیا تھا اس لئے بات بڑھتے بڑھتے سیکرٹری تک پہنچی۔ وہ (انگریز) سیکرٹری علومِ مشرقی میں بھی کافی درک رکھتا تھا۔ اس نے مجھے بلایا تو میں نے کہا کہ یہ ایک مذہبی تقریب ہے اور شرک جیسا مسئلہ میرا موضوع ہے اس لئے میری تقریر میں کونسی بات قابلِ اعتراض ہو سکتی ہے؟ یہ سُن کر وہ مسکرایا اور مجھ سے کہا کہ کیا قرآن کی رُو سے شرک کا یہ مفہوم نہیں کہ حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے اور اس کے حقِ حکومت میں کوئی انسان شریک نہیں ہو سکتا! ــــــ میں اس کی زبان سے یہ سُن کر ورطۂ حیرت میں گم ہو گیا۔ پھر سنبھل کر کہا کہ قرآن مجید کی رُو سے حقیقت تو یہی ہے ــــــ اس پر اس نے کہا کہ پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہاری تقریر کو

سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ سیاست تو ایک طرف۔ یہ نظریہ تو ہر حکومت کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ (ضمناً۔ اس کے باوجود اس نے مجھے یہ کہہ کر تقریر کرنے کی اجازت دے دی کہ ریڈیو والے تمہاری تقریر کا خود جائزہ لے لیں گے)۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآنِ مجید کی رُو سے شرک کا مفہوم کیا ہے؟ ان تصریحات کی روشنی میں، سورۃ النور کی مذکورہ صدر آیۂ جلیلہ کا ملخص یہ ہے کہ:

(۱) اسلامی مملکت ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجہ میں ملتی ہے۔

(۲) اس مملکت کا مقصد، دین کا تمکن ہے۔

(۳) دین کے تمکن کے معنی یہ ہیں کہ محکومیت صرف اللہ (کی کتاب) کی اختیار کی جائے۔

(۴) اگر کتاب اللہ کے ساتھ کچھ اور ملا دیا جائے تو وہ انسانی حکومت ہو جائے گی جو شرک ہے۔

اور (۵) شرک کا نتیجہ خوف ہے۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ خوف اور بھوک خدا کا عذاب ہے۔ سورۃ القریش میں مخالفین کو جو ربِ کعبہ کی محکومیت اختیار کرنے کے لئے کہا گیا ہے تو اس رب کی خصوصیاتِ کبریٰ یہ بتائی گئی ہیں کہ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ..... (۱۰۶/۴) "وہ بھوک اور خوف کے عذاب سے نجات دلاتا ہے"۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ۝ (۲۰/۱۱۲) "جو شخص (یا قوم) ضابطۂ قوانینِ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کر کے خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے گا، اسے نہ کسی ظالم کے ظلم کا خوف ہوگا، نہ کسی حق تلفی کرنے والے کے سلب و نہب کا اندیشہ۔ وہ انسانی استیلاء و استبداد اور جور و استحصال (EXPLOITATION) سے مامون رہے گا۔ نہ کوئی اس پر ظلم و زیادتی کر سکے گا، نہ ہی اس کی محنت کے ماحصل کو چھین جھپٹ کر لے جا سکے گا۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

سورۃ النور کی زیرِ نظر آیت کے آخری الفاظ ہیں: وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۲۴/۵۵)۔ جو قوم اس قسم کا نظام قائم کرنے کے بعد، اس سے برگشتہ ہو جائے گی، تو وہ ان تمام برکات سے محروم ہو جائے گی۔

قبل اس کے کہ ہم اس حرماں نصیب قوم کی طرف تعزیت کے لئے جائیں، ایک اہم نکتہ کی

خدا کا خوف

وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے بتایا ہے کہ خوف اُمّ الخبائث ہے۔ یعنی تمام برائیوں کی جڑ۔ اور قرآنی تعلیم و نظام کا مقصود اس مرض سے نجات دلانا ہے۔ لیکن قرآنِ مجید میں خدا کے خوف کا بار بار ذکر آتا ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟

خوف کے معنی کسی آنے والے خطرہ، یا کسی غلط کام کے مضرت رساں نتیجہ کے احساس کے بھی ہیں۔ مثلاً یہ ڈر کہ اگر میں نے آگ میں ہاتھ ڈال دیا تو اس سے میرا ہاتھ جل جائے گا اور اس سے بڑی اذیت ہوگی اس لئے مجھے آگ کے قریب نہیں جانا چاہیئے۔ اس خوف کے معنی ہوں گے کسی

آنے والے خطرہ کے احساس سے ان اسباب کا سد باب کرنا جن سے اس خطرہ کے پیدا ہونے کا امکان ہو۔ قرآن میں مومنین کے متعلق کہا ہے یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا (۷۶/۷) وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں کیونکہ انہیں اس کا "خوف" رہتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو معاشرہ ایسی شکل اختیار کر لے گا جس میں چاروں طرف شر پھیل جائے گا۔ (اگلی آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ اس عالمگیر فساد کو روکنے کے لئے خدا کے نظام ربوبیت کو عام کر دیتے ہیں تاکہ نہ کوئی بھوکا رہے اور نہ وہ معاشرہ میں فساد پھیلانے کے لئے اٹھ کھڑا ہو)

لہٰذا، خدا سے ڈرنے کے معنی ہیں، قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے مضرت رساں نتیجہ کے احساس سے، اس سے محتاط رہنے کا جذبہ۔ اس "خوف" کے متعلق تو خود حضور نبی اکرمؐ کی لسان مبارک سے کہلایا گیا کہ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵) "خدا کا قانون مکافات عمل اس قدر ہمہ گیر ہے کہ (اور تو اور) اگر (بفرض محال) میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو ڈرتا ہوں کہ میں بھی اس کے مضرت رساں نتیجہ سے بچ نہیں سکوں گا۔"

یہ ہے خدا کے خوف کا مفہوم۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان (فرد مومن) اس کے قوانین کی خلاف ورزی سے محتاط رہے گا۔ یہ احتیاط اسے ہر قسم کے خوف سے مامون کر دے گی۔ (اس احساس کو تقویٰ کہتے ہیں اسی لئے کہا کہ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۷/۳۵) جو احتیاط برتے گا اور اس طرح اپنی اصلاح کر لے گا تو اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ اقبالؒ نے اس "خوف" اور انسانوں کی طرف سے مسلط کئے جانے والے خوف کے فرق کو بڑے عمیق انداز سے واضح کیا ہے جب کہا ہے کہ

یک غم است آں غم کہ آدم را خورد آں غم دیگر کہ ہر غم را خورد (زبور عجم ص ۲۵۳)

ایک غم وہ ہے جو انسان کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا جاتا ہے۔ اور ایک غم وہ ہے جو دنیا کے ہر غم سے نجات دلا دیتا ہے۔ حفیظ ہوشیار پوری (مرحوم) نے اسے باندازِ تغزل بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ کہا ہے؛

زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم یہ غم ہوگا تو کوئی غم نہ ہوگا

سزا کا خوف

اتنا اور واضح کر دیا جائے کہ قرآنی نظام مملکت میں بھی مجرموں کو سزا کا خوف ہوگا۔ قرآن کی رو سے "جرم و سزا" کے موضوع پر میں الگ لکھ چکا ہوں، اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ (ملاحظہ ہو طلوع اسلام بابت جون ۱۹۷۷ء)۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ:

۱۔ جب قرآنی نظام میں ہر شخص خوف اور حزن سے مامون ہوگا، اور کسی کی کوئی ضرورت رکی نہیں رہے گی تو ارتکاب جرم کے نناوے فی صد محرکات اسی سے ختم ہو جائیں گے۔

۲۔ قرآن کریم اپنے ہر قانون کی علت بیان کر دیتا ہے۔ یعنی وہ سمجھا دیتا ہے کہ ایسا قانون کیوں بنایا گیا ہے۔

---

[1] خدا نے اپنی طرف حزن کا لفظ کہیں منسوب نہیں کیا۔ ہر جگہ خوف ہی کہا ہے۔ اور (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) اس خوف کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی خلاف ورزی سے بچنے کی احتیاط۔ ظاہر ہے کہ احتیاط سے حزن پیدا نہیں ہوتا۔

اس کی پیروی کرنے سے کیا مفادات حاصل ہوں گے اور اس کی خلاف ورزی سے کس قسم کے مضرات جنم لیں گے۔ جب کسی قانون کو اس طرح سمجھ لیا جائے تو اس سے ذہن مطمئن ہو جاتا ہے اور یہ اطمینان بھی بڑی حد تک انسداد جرائم میں مانع ہوتا ہے۔

۳۔ اس نظام میں کسی کو اس کا دھڑکا نہیں لگا رہتا کہ معلوم کل کو کس قسم کا قانون نافذ ہو جائے۔ یا اگر موجودہ حکومت کی جگہ دوسری حکومت برسرِ اقتدار آ جائے تو پتہ نہیں وہ کس قسم کا الٹ پلٹ کر دے۔ قرآن نے جو اپنے اصول و حدود کو غیر متبدل قرار دیا ہے تو اس سے اسی قسم کا اطمینان پیدا کرنا مقصود ہے۔ ہر شخص ان اصول و اقدار کو سمجھ سوچ کر اختیار کرے گا اور پھر مطمئن رہے گا کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

۴۔ اس نظام میں یہ بھی نہیں ہوگا کہ کسی مضرت رساں قانون کو کسی سابقہ تاریخ سے نافذ کر دیا جائے۔ ایسا کرنے سے افرادِ معاشرہ کے دلوں میں عدمِ اطمینان کا جو مستقل اضطراب موجزن رہتا ہے، ظاہر ہے۔

۵۔ اس قدر احتیاط کے باوجود اگر معاشرہ میں ایسے افراد موجود ہیں جو جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں، تو انہیں آپ مزمن امراض کے مریض سمجھ لیجئے۔ بایں ہمہ، معاشرہ کو ان کی دراز دستیوں (یا پاگل پن) سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ انہیں اس سے روکا جائے۔ بالفاظِ دیگر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآنی نظام کی جو بنیادی خصوصیت ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ (اس میں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا) تو اس قسم کی فضا کو قائم رکھنے کے لئے، مجرمین کے خلاف تعزیری اقدامات لاینفک ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ کے کلی امن کے لئے اس قسم کا استثنائی خوف ناگزیر ہوتا ہے۔

۶۔ قرآن کریم اس قسم کے مجرمین کو درحقیقت نفسیاتی مریض تصور کرتا ہے۔ سزا کا خوف بھی نفسیاتی امراض کا علاج ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو اس نے کہا ہے کہ اگر مجرم میں احساسِ ندامت ہو، وہ اپنے کئے پر پچھتائے اور اس میں اصلاح کا امکان ہو، تو اسے معاف کر دیا جائے۔ (قرآن نے ہر جرم میں معافی کی گنجائش رکھی ہے) سزا اسے ہی دی جائے گی جس کا مرض لاعلاج ہو اور معاشرہ کے امن کو برقرار رکھنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہ ہو۔

صدرِ اوّل کے بعد

اب ہم اس آیت (۲۴/۵۵) کے آخری حصّہ کی طرف آتے ہیں وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ اس نظام کے قائم ہو جانے کے بعد، جو لوگ اس سے منحرف ہو جائیں گے تو ان کا حشر فاسقوں جیسا ہوگا۔ قرآن کریم میں فاسقین کے متعلق بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ ہم اس میں سے صرف دو نکات کو سامنے لاتے ہیں۔ ایک یہ کہ۔ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوٗنَ ۔ (۳۲/۱۸) مومن اور فاسق ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اس سے واضح ہے کہ مومن اور فاسق ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ فاسق کہتے کسے ہیں۔ فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵/۴۷)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو فاسق کہتے ہیں۔

صدرِ اول میں (آیت ۲۴/۵۵) کے مطابق جو حکومت قائم ہوئی تھی وہ مومنین کی حکومت تھی جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی تھی۔ اس نہج حکومت میں، انسانوں کے ہاتھوں سے اقتدار چھن گیا۔ نہ ملوکیت (یا بادشاہت یا آمریت) باقی رہی، نہ مذہبی پیشوائیت۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست   نقشہائے کاہن و پاپا شکست   (جاوید نامہ ص ۹)

قرآنی نظام کے متمکن ہو جانے کا نتیجہ تھا کہ مذہبی پیشوائیت کے نقوش تک مٹ گئے۔

اس کے بعد اس قوم نے کیا کیا؟

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست   خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت   دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر

عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر   (جاوید نامہ ص ۸۷)

آسمان کی آنکھ نے اس قسم کا تماشا بہت کم دیکھا ہوگا کہ جس قوم نے قیصر و کسریٰ کے تختوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے، اسی قوم نے ان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اکٹھا کیا۔ جوڑا، شاہنشاہیت کے تخت بنائے اور خود ان پر براجمان ہو گئی۔ قوم مذہب پرست تھی۔ ان شاہنشاہوں نے نظامِ ملوکیت کو مستحکم کرنے کے لئے مذہب ہی کو آلہ بنایا دین نے تو ملوکیت کی جڑ کاٹ دی تھی۔ انہوں نے دین کو مذہب سے بدل دیا۔ یہ فریضہ مذہبی پیشوائیت نے سرانجام دیا۔ انہوں نے قرآن کی اصطلاحات کو تو علیٰ حالہٖ رہنے دیا۔ اس کے مفہوم کو بدل دیا۔

اقبالؒ کے الفاظ میں۔

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں   ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

انہوں نے قرآن کو بدلنے کے لئے جو حربے استعمال کئے وہ ایسے لطیف اور غیر محسوس تھے کہ عوام کی نگاہیں انہیں بھانپ نہیں سکتی تھیں۔ (مثلاً) دین میں الٰہ کے معنی تھے صاحبِ اقتدار۔ حاکم۔ اس لئے لا الٰہ الا اللہ کے معنی تھے "کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں۔ حکومت صرف خدا کی جائز ہے ———

حکمران بس اک وہی باقی بتانِ آذری۔ انہوں نے الٰہ کے معنی کر دیئے "وہ جس کی پرستش کی جائے"۔ ان معانی کی رو سے لا الٰہ الا اللہ کے معنی ہو گئے۔ پرستش صرف خدا کی جائز ہے۔ اور کسی کی نہیں۔ اس طرح خدا کو مقامِ حاکمیت سے اتار کر پرستش گاہوں کے محراب میں بٹھا دیا اور تختِ حکومت، سلاطین نے بلا شرکتِ غیرے سنبھال لئے۔ عبادت کے معنی محکومیت کے بجائے، پرستش اور بندگی کر لئے اور مومن کے نعرۂ انقلاب آفرین اِیَّاکَ نَعْبُدُ (ہم صرف تیری حاکمیت تسلیم کرتے ہیں۔ اور کسی کی نہیں) کے معنی ہو گئے۔ ہم صرف تیری پرستش کرتے ہیں۔ یعنی پرستش خدا کی اور حکومت بادشاہوں کی۔ ان بادشاہوں کے متعلق کہہ دیا۔ السلطان ظل اللہ علی الارض۔ "بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے"۔ اور ان کے ہر حکم کو فرمانِ خداوندی کا درجہ دے دیا۔ یہ عقیدہ وضع کر دیا کہ انہیں خدا ہی نے ملک اور حکومت عطا کئے ہیں اس لئے وہ جو کچھ کرتے ہیں خدا کی مرضی سے کرتے ہیں۔

شخصی حکومتوں میں معاشرہ پر جس قدر خوف طاری رہتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس خوف سے (اقبالؒ کے الفاظ میں) ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں اور افرادِ معاشرہ کا قلب و دماغ مشل ہو کر رہ جاتا ہے ان کی نہ آنکھیں اپنی رہتی ہیں نہ کان۔ نہ دل اپنا رہتا ہے نہ دماغ۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ" وہ مقام انسانیت سے گر کر حیوانی سطح پر آجاتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ پست سطح پر۔

اس قسم کے مذہب کو مستحکم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ اربابِ مذہب کی مستقل تائید و اعانت حاصل رہے۔ اس کے لئے انہوں نے مذہبی پیشوائیت سے سمجھوتا کر لیا کہ امورِ حکومت ملوکیت کے اقتدار میں رہیں گے اور امور شریعت سے متعلق مذہبی پیشواؤں کے احکام نافذ ہوں گے۔ حکمرانوں کے کسی فیصلہ کی خلاف ورزی سے خوف پیدا ہوتا تھا تو اربابِ شریعت کے فتویٰ سے اعراض برتنے سے خوف اور حزن دونوں۔ جب کوئی اقلیم شریعت کا حکمران کہہ دے کہ تمہارے لباس کی تراشش خراشش غیر شرعی ہے اس لئے تمہیں عذابِ قبر بھی ہوگا اور عذاب جہنم بھی۔ تو اس سے آپ کا قلب جس حزن و ملال کی آماجگاہ بن سکتا ہے، ظاہر ہے۔ آگے بڑھیئے۔ اگر کسی نے غصہ میں آکر اپنی بیوی سے کہہ دیا۔ طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔ لیکن جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے ان الفاظ پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن بارگاہِ شریعت سے فتویٰ صادر ہو گیا کہ تمہاری بیوی تم پر حرام ہو گئی ہے۔ وہ پھر سے تمہاری بیوی اسی صورت میں بن سکتی ہے کہ ایک رات کسی غیر مرد سے ہم بستر ہو۔ اس حکم سے اس مظلوم بے قصور بڑھیا کے دل پر جو گزر سکتی ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا؛ اس کے حزن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اگر انہوں نے کسی کے متعلق کہہ دیا کہ تمہارے عقائد اسلام کے مطابق نہیں رہے تو وہ مرتد قرار پا گیا۔ اور یہ شاید آپ کو معلوم ہی ہو کہ ان کی مملکت میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ جس طرح آج کل ٹریفک پولیس کی دست برد سے بچنے کے لئے "فوٹو۔ بلا" اپنے جیب میں رکھتے ہیں، ہمارے دورِ ملوکیت میں، لوگ ان حضرات کا سارٹیفکیٹ اپنے جیب میں رکھتے تھے کہ اس کے عقائد مطابق اسلام ہیں۔ یہ ہوتا ہے خوف کا عالم انسانی حکومتوں کے دور میں۔

حکومت اور شریعت کی مملکتیں تو پھر بھی محسوس تھیں۔ ان کے علاوہ ایک اور مملکت وجود میں آئی جس کا عالم محسوسات میں نیہ نشان تک نہیں تھا، لیکن ان کی گرفت ان دونوں سے کہیں زیادہ شدید اور محکم تھی۔

"یا حضرت! میں تباہ ہو جاؤں گا۔ برباد ہو جاؤں گا۔ میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ میرا نذرانہ مسترد نہ فرمایئے مجھے اپنے در کے کتوں کے زمرے سے خارج نہ کیجئے"

یہ تو پھر بھی زندہ حضرت صاحب کی سوءِ مزاج کا خوف ہے۔ حالت یہ ہے کہ اگر کسی مزار کی طرف (جو دیکھو لیے ہے) بلشت ہو گئی ہے، تو رو رہے ہیں۔ گڑگڑا رہے ہیں کہ معلوم اب کیا غضب نازل ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر اپنے گھر کی تنہائیوں میں بیٹھے، حضرت صاحب، کے کسی نقشِ قدم کے متعلق سوءِ ظن کا شائبہ بھی دل میں گذر گیا ہے، تو رات بھر سو نہیں سکتے۔ اور اس اضطراب سے نجات نہیں مل سکتی جب تک ان کی بارگاہ معلیٰ میں حاضر ہو کر اس گناہِ عظیم کا کفارہ نہ ادا کر دیا جائے۔

بادشاہوں کی حکومت جسموں پر ہوتی ہے۔ ان اربابِ اقلیم روحانیت کی دلوں پر۔ ملوکیت کا اس میں بھی مفاد ہوتا ہے کہ ان حضرات کی روحانی سلطنت قائم و دائم رہے کیونکہ قوم جس قدر خوف اور حزن کی برنائی سلوں کے نیچے

دبی رہے گی، اس پر حکومت کرنا اتنا ہی آسان ہوگا۔ اس لئے بڑے بڑے شاہنشاہ ان کی درگاہوں پہ نذر لئے لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ ارباب اقتدار ان کے عرسوں میں حاضری دیتے، اور ان تمام رسوم میں بصد عقیدت شریک ہوتے ہیں جو جہالت کی تخلیق ہوتی ہیں۔ یہ ان میں اس لئے شرکت کرتے ہیں کہ ایک طرف عوام کے دلوں میں ان مزاروں اور مزاروں میں دفن شدگان کے پاسبانوں کی عقیدت اور بھی زیادہ ہو جائے، اور دوسری طرف یہ خود بھی عوام کی نظروں میں عزیز تر ہو جائیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایک ملوکیت (شخصی حکومت) سے خوف اور حزن کے کتنے ہی پھاٹک کھل گئے۔ اقبالؒ نے ان تفصیلات کو ایک شعر میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جب کہا کہ

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت   حریت را زہر اندر کام ریخت   (اسرار و رموز ص۱۲)

جب حکومت سے قرآن کا رشتہ منقطع ہو گیا تو آزادی و حریت کا گلا گھٹ گیا۔ ملت کی رگِ حیات میں زہر سرایت کر گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ نتیجہ کہ دنیا نے یہ عبرت انگیز نظارہ دیکھا کہ

مومن و پیش کساں بستن نطاق   مومن و غداری و فقر و نفاق

مومن! اور حالت یہ کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی کا پٹہ گلے میں ڈالے ہوئے؛ مومن! اور اس کی اخلاقی پستی کا یہ عالم کہ غداری۔ محتاجی اور منافقت اس کے معمول زندگی بن گئے! (استغفراللہ)۔

با پشیزے دین و ملت را فروخت   ہم متاع خانہ و ہم خانہ سوخت

دین اور ملت کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دینے والا۔ گھر کا سامان ہی نہیں، خود اپنے گھر کو پھونک ڈالنے والا۔

لا الٰہ اندر نمازش بود و نیست   نازہا اندر نیازش بود و نیست

جب یہ مومن تھا تو اس کی نماز اس کے اس ایمان کی شہادت دیتی تھی کہ خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ وہ سجدے میں سر جھکاتا تھا تو عرش کی بلندیاں اس کی پیشانی میں جھکتی نظر آتی تھیں۔

نور در صوم و صلوٰۃ او نماند   جلوۂ در کائنات او نماند

اس کی نماز اور روزوں میں کبھی نور کی شمعیں جگمگاتی تھیں۔ اب وہ گل ہو گئیں۔ اس کی دنیا میں روشنی کا نام تک نہ رہا۔

روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام   فرد ناہموار و ملت بے نظام

جب اس کی نماز اور روزوں کی روح گم ہو گئی اور وہ رسوم بن کر رہ گئے، تو فرد کی سیرت میں اعتدال باقی نہ رہا اور قوم کا نظام ختم ہو گیا۔ فرد کی ذات میں انتشار پیدا ہو گیا اور قوم کی اجتماعیت میں تفرقہ۔

سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی   از چنیں مرداں چہ امید بہی!

اس کے سینے میں قرآن نے جو حرارت پیدا کی تھی جس سے اس کی رگِ حیات میں خونِ زندگی برقِ تاب تھا، وہ حرارت باقی نہ رہی۔ سوچئے کہ ایسے افراد سے بہتری کی کوئی امید بھی وابستہ کی جا سکتی ہے؟

قرآن کی مرکزیت کے باقی نہ رہنے سے ان کے تفرقہ اور اختلاف کی یہ حالت ہے کہ

ہر کسے بر جادۂ خود تند رو   ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دو

ہر فرقہ اپنے اپنے طریق پر بھاگے چلا جا رہا ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ ہم اسلام کے صراطِ مستقیم پر

گامزن ہیں۔ قوم کیا ہے؟ ایک شتر بے مہار ہے کہ جس طرف اس کا جی چاہے منہ اٹھا کر چل دے! فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ۔ (۲۶/۲۲۵)

اسی حقیقت کو وہ ارمغانِ حجاز میں بڑے درد و کرب سے بیان کرتے ہیں کہ:

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے | کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق | ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟ | کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں | نے گرمیِ افکار نہ اندیشۂ بے باک

آخر میں ان تمام سوالوں کا ایک جواب یوں دیتے ہیں کہ:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری (۲۴)

شخصی حکومتوں کی زنجیروں، انسانوں کی وضع کردہ شریعت کی جکڑبندیوں اور طریقیت کی توہم پرستیوں نے قوم کی جرأت و بسالت کی انسانیت ساز صلاحیتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے، اور ہر سینہ خوف و ہراس کا نشیمن بن کر رہ گیا ہے — نے گرمیِ افکار نہ اندیشۂ بیباک۔ آپ غور کیجئے کہ دنیا میں قریب ایک ارب مسلمان نام رکھنے والے افراد کی حالت کیا ہے؟ قرآن نے انہیں امتِ واحدہ بنایا تھا۔ یہ نسل اور وطن کی بت پرستی سے بیسیوں اقوام میں بٹ چکی ہے جن میں کی ہر قوم دوسری قوم سے لرزاں و ترساں ہے، اور تمام اقوام کسی نہ کسی سُپر پاور کی محتاج، فلہٰذا اس سے خائف۔ پھر ایک قوم کے اندر افراد کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے محکوم ہیں جن کے استبداد کی تلوار ہر وقت ان کے سر پر لٹکی رہتی ہے۔ اس طرح وہ خوف اور حزن کے اس جہنم میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ۔

سوال پھر یہی سامنے آتا ہے کہ ہماری یہ حالت کیوں ہو گئی؟ اس کا جواب ہم سے نہیں۔ اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی لسانِ مبارک سے سنیئے جس کی رسالت نے ہمیں خاک کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ قرآن کریم نے اسے بڑے جامع محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے۔ حشر کا میدان ہے۔ تمام اقوامِ سابقہ ایک ایک کر کے اپنے اپنے رسول کے زیرِ شہادت بارگاہِ خداوندی کے سامنے سے گزر رہی ہیں۔ جب ہماری باری آتی ہے تو حضور نبی اکرمؐ بصد آہ و سوز ناک یہ اعلان فرماتے ہیں کہ:

يٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُورًا (۲۵/۳۰)۔

اے میرے رب! یہ میری وہ قوم ہے جس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

غور فرمائیے! حضورؐ یہ نہیں فرماتے کہ اس قوم نے روایات کو چھوڑ دیا تھا۔ فقہ کو چھوڑ دیا تھا۔ مسلکِ خانقاہی کو چھوڑ دیا تھا۔ حضورؐ ایک ہی چیز کا نام لیتے ہیں۔ اور وہ ہے قرآن۔ یعنی اس قوم کی یہ حالت اس لئے ہوئی تھی کہ اس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

قرآن کو اپنی زندگی کا مرکز اور محیط قرار دیا تھا تو لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) کے مقامِ بلند پر فائز ہو گئی تھی۔ یہی مقامِ مومن تھا۔ اسی کا نام اسلامی مملکت تھا۔ یعنی خالص کتاب اللہ کی حکمرانی۔ اسے چھوڑا تو حالت یہ ہو گئی کہ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (۶۳/۴)۔ کہیں کوئی پتہ کھٹکا اور یہ لرز اٹھے کہ آئی کوئی نئی مصیبت! اس خوفِ پیہم اور حزنِ مسلسل میں یہ قوم زندگی بسر کر رہی ہے۔ اور طرفہ تماشا یہ کہ یہ قوم (یا مسلمان نام رکھانے والی اقوام) اس خوش فہمی (فریبِ نفس) میں مبتلا ہیں، یا وہ اپنے عوام کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں اسلام کا احیاء، بلکہ فروغ ہو رہا ہے۔ ہمارے دور میں، اسلام کو سب سے زیادہ نقصان اس فریب خوردگی یا فریب دہی نے پہنچایا ہے غیر مسلم اقوام ان کی اس خوش فہمی کو پختہ تر کرنے کے لئے یہ حربہ استعمال کرتی ہیں تاکہ —— ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں (ارمغانِ حجاز) مسلمان مملکتیں خوش ہیں کہ عوام کی نگاہ قرآنی نظام کی طرف اٹھنے نہیں پائے گی تو ان کے اقتدار کو کوئی خطرہ درپیش نہیں ہو گا۔ اور غیر مسلم اقوام مطمئن ہیں کہ اس طرح وہ نظام قائم ہی نہیں ہو سکے گا جس کے متعلق خدا نے کہا تھا لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹/۳۳) "وہ تمام نظامہائے عالم پر غالب آ جائے گا۔"

اور ظاہر ہے کہ جب (اعلانِ رسالتمآب کے مطابق) ہماری یہ حالت قرآن ترک کر دینے سے ہوئی ہے تو اس کا علاج قرآن کی حکمرانی کے سوا کچھ نہیں۔ اقبالؒ نے اسی لئے کہا تھا کہ

برخورد از قرآن اگر خواہی ثبات　　　در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

می دہد ما را پیام لاتخف　　　می رساند بر مقام لاتخف　　　(مثنوی ص ۴۳)

اگر تم ثبات چاہتے ہو تو قرآن کی حکمرانی قائم کرو۔ اسی میں رازِ دوامِ حیات پوشیدہ ہے۔ اسی سے تم اس مقام پر پہنچ سکتے ہو جہاں نہ کسی کا خوف ہو گا۔ نہ حزن۔ میں اسے پھر دہرا دوں کہ (قرآن کی رو سے) کسی مملکت کے اسلامی ہونے کا اوّلیں معیار یہ ہے کہ اس میں افرادِ معاشرہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہو، نہ حزن۔ اس لئے کہ اس میں کیفیت یہ ہو گی کہ

کس در اینجا سائل و محروم نیست　　　عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس میں نہ کوئی روٹی کے لئے کسی کا محتاج ہو گا۔ نہ اس میں کوئی حاکم ہو گا نہ محکوم۔ نہ آقا ہو گا نہ غلام۔ جب کیفیت یہ ہو گی تو خوف و حزن کہاں سے آ سکے گا؟ کوئی مملکت، محض آئین و دستور اور قوانین و ضوابط کے "شرعی" ہونے سے اسلامی نہیں بن سکتی۔ وہ معاشرہ میں اس قسم کی فضا پیدا کرنے سے اسلامی بن سکتی ہے۔ جس مملکت میں قرآن کی حکمرانی نہیں ہو گی اس میں خوف و حزن ہو گا، اور جس مملکت میں خوف و حزن ہو گا اس کا اسلامی ہونے کا ہر دعویٰ باطل ہو گا۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔ والسلام

(۹۔ نومبر۔ یومِ پیدائش علامہ اقبالؒ)　　　پرویز